حقوق زوجین

(۵)

قرآن مجید چونکہ ایک اصولی کتاب ہے اس لیے ان جزئی مسائل کو جو ازدواجی معاملات کی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں اس نے تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے لیکن چند ایسے وسیع اصول بیان کر دیے گئے ہیں جو تقریباً تمام جزئیات پر حاوی ہیں اور قانون سازی میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں پس قانون کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے قواعد و اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

(۱) وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ (۲:۲۷) وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا (۲:۲۷) وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ (۵:۱)

ان آیات میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے نہیں ہو سکتا۔ البتہ اہل کتاب کی عورتیں اس کے لیے حلال ہیں مگر مسلمان عورت نہ مشرک کے نکاح میں آسکتی ہے نہ اہل کتاب کے۔

۲۔ وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ ..... وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ (۲:۲۷) وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ (۲۴:۳۲) فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ (۴:۲۵)

ان آیات سے یہ قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو خود اپنا نکاح کرنے کا کلی اختیار حاصل ہے، اور اس میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں لیکن عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء اور عزیز و قریب مردوں کی رائے کا دخل بھی ہے اور وہ اپنے نکاح کے معاملہ میں بالکل آزاد نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث الایم احق بنفسها من ولیها اور لا تنکح البکر حتی تستاذن کی رو سے نکاح کے لیے عورت کی رضامندی ضروری ہے، اور کسی کو اس پر جبر کرنے کا حق حاصل نہیں، مگر چونکہ عورت کے نکاح کا مسئلہ خاندان کے مفاد سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے اس لیے قرآن مجید نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ شادی کے معاملہ میں تنہا عورت کی خواہش کافی نہیں بلکہ اس کے رشتہ دار مردوں کی رائے کو بھی اس میں دخل ہے۔

(۳) فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (۴:۴) وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ

وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ (۴:۳) فَاِنْ طَلَّقْتُمُوْھُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْھُنَّ .... فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (۲:۳۱)۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اُس تمتع کا عوض ہے جو مرد اپنی بیوی کی مقاربت حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا مقاربت کے بعد ہی پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور کسی صورت میں وہ ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ عورت یا تو اپنی خوشی سے معاف کر دے (فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَکُلُوْهُ هَنِیْٓئًا مَّرِیْٓئًا) یا خلع کے معاوضہ میں چھوڑ دے (فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ)۔

(۴) وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا۔ (۴:۳)۔

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت میں مہر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے لہٰذا قانون کے ذریعہ سے اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (۴:۶)۔

اس آیت کی رو سے نفقہ مرد پر عورت کا واجبی حق ہے اور یہ ان حقوق زوجیت کا معاوضہ ہے جو رشتہ نکاح سے مرد کو عورت پر حاصل ہوتے ہیں۔ عورت کا یہ حق کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ وہ خود اس سے دست بردار ہو جائے، یا نشوز کی مرتکب ہو۔

(۶) وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (۲:۳۱)۔

یہاں نفقہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی تعیین میں مرد کی استطاعت کا لحاظ کیا جائیگا۔ مالدار مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور غریب مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق۔

(۷) وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا (۴:۶)۔

اس آیت کی رو سے مرد کو سزا دینے کا اختیار صرف اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ عورت نشوز اور عدم اطاعت کی روش اختیار کرے۔ اور اس صورت میں بھی سزا کی صرف دو شکلیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ایک ہجر فی المضاجع یعنی ترک صحبت۔ دوسرے ضرب غیر مبرح یعنی ہلکی مار جو صرف انتہائی درجہ کے نشوز میں جائز ہے۔ اس حد سے تجاوز کرنا یعنی بغیر نشوز کے سزا دینا، یا کم درجہ کے نشوز پر انتہائی سزا دینا، یا انتہائی نشوز پر ضرب غیر مبرح کی حد سے گذر جانا ظلم میں داخل ہے۔

(۸) وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا (۴: ۶)۔

اس آیت میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور خود آپس میں صلح کر لینے کی کوئی صورت نہ پیدا ہو تو ایک شخص مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک شخص عورت کے رشتہ داروں میں سے بطور حکم مقرر کیا جائے، اور دونوں حکم مل کر ان کے جھگڑے کا تصفیہ کریں۔ وَإِنْ خِفْتُمْ اور فَابْعَثُوا کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں، اس لیے حکم مقرر کرنا انہی کا کام ہے، اور اگر حکمین کوئی تصفیہ نہ کر سکیں تو آخر میں تصفیہ کا اختیار انہی کو حاصل ہے۔

(۹) فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔ (۲: ۲۹)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زوجین کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت قاضی کو سب سے زیادہ جس امر کا لحاظ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ آیا وہ دونوں اپنے ازدواجی تعلق میں حدود اللہ پر قائم رہ سکیں گے یا نہیں؟ اگر ظن غالب اس امر کا ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو پھر کوئی چیز اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کی خاطر زوجین کے درمیان جمع کا فیصلہ کرنا جائز ہو۔ سب سے اہم شئے اللہ تعالیٰ کی حدود کا تحفظ ہے۔ اور اس کے لیے اگر ضروری ہو تو ہر چیز قربان کر دی جا سکتی ہے۔

وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (۲: ۲۹)۔

(۱۰) وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا (۲: ۲۹)۔

اس آیت میں قانون اسلامی کے ایک دوسرے اہم قاعدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کے بند نکاح میں اس طرح نہ روکی جائے کہ اس کے لیے موجب ضرر اور وجہ حق تلفی ہو۔ معاشرت ہو تو بالمعروف ہو (وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ) اگر روکا جائے تو معروف کے ساتھ روکا جائے (فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ) جہاں اس کی کوئی امید نہ ہو، اور اس کے برعکس ضرر اور حق تلفی کا خوف ہو، وہاں تسریح باحسان پر عمل کرنا ضروری ہے، کیونکہ حسب ارشاد نبوی اسلام کے قانون میں نہ کوئی چیز مضر پہونچانے والی ہے اور نہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے: لا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِي الْإِسْلَامِ۔

(۱۱) فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴: ۱۹)۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع کے لیے نازل ہوی ہے مگر اس کے آخری ٹکڑے میں ایک عام قاعدہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ یہ کہ کسی عورت کو ایسی حالت میں نہ چھوڑا جائے کہ وہ ایک شخص کے رشتہ نکاح میں بندھ کر معلق ہو جائے، یعنی نہ تو اس کو شوہر کی معیت اور معاشرت ہی نصیب ہو اور نہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لینے کی آزادی حاصل ہو۔

(۱۲) لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ (۲: ۲۸)۔

اس آیت میں عورتوں کی اوسط قوت برداشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی چار مہینے تک وہ ضرار اور حدود اللہ سے تجاوز کے بغیر شوہر کی صحبت سے محروم رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کسی ایک چیز کا خوف ہے۔ اس آیت کا بھی ایک خاص محل ہے، مگر یہ اپنے محل کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی رہنمائی کرتی ہے۔

(۱۳) وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ (۲۴: ۱)

اس آیت میں لعان کا قانون بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور گواہی نہ پیش کر سکے تو اس سے چار مرتبہ قسم لی جائے گی کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے، اور پانچویں بار یہ کہلوایا جائیگا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔ اس کے بعد عورت زنا کی سزا سے صرف اس طرح بچ سکتی ہے کہ وہ بھی چار مرتبہ یہ قسم کھائے کہ اس کے شوہر کا الزام جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر اس کے شوہر کی بات سچی ہو تو مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اس طرح جب ملاعنت کی تکمیل ہو جائے تو زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔

(۱۴) اِلَّآ اَنۡ یَّعۡفُوۡنَ اَوۡ یَعۡفُوَا الَّذِیۡ بِیَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّکَاحِ (۲: ۳۱)۔

اس آیت کے آخری فقرہ میں اس قاعدہ کی تصریح کی گئی ہے کہ عقدۂ نکاح مرد کے ہاتھ میں ہے، اور وہی اسے باندھنے اور کھولنے کا اختیار رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں طلاق کا ذکر آیا ہے، مذکر کے صیغوں میں آیا ہے، اور اس فعل کو مرد ہی کی طرف نسبت دی گئی ہے مثلاً وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنۡ طَلَّقَهَا۔ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر بحیثیت شوہر ہونے کے طلاق دینے یا نہ دینے کا کلی اختیار رکھتا ہے، اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو اس کا یہ حق سلب کرتا ہو۔

لیکن اسلام میں تمام حقوق اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ان کے استعمال میں ظلم اور حدود اللہ سے تجاوز نہ ہو۔ وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ (۶۵: ۱) جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اس کا حق سلب کر لیا جائے۔ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ (۲: ۲۸۰) "نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمہارا نقصان کیا جائے"۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے جو اسلامی قانون کے ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں جاری ہوتا ہے، اور مرد کا حق طلاق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پس جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے ظلم و ضرر کی شکایت ہو تو بقاعدہ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ

فِی شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اس کی شکایت اللہ اور رسول کے قانون پر پیش کی جائے گی اور اگر اس قانون کی نگاہ میں اس کی شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کو نافذ کرنے والوں یعنی اولی الامر کو حق ہوگا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کرکے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطلیق کے جو اختیارات شرع میں دیے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہاء کی ایک جماعت نے بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں اور اس قاعدہ میں کوئی استثنا نہیں، اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں کہ اس کے اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے لیکن قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا

(۱۵) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۔ (۲ : ۲۹)

اس آیت میں طلاق کا نصاب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق رجعی ہے اور تیسری مرتبہ کی بائن۔

مسائل جزئیہ ان اصولی احکام کو جس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اب اسی ترتیب کے ساتھ ہم ان جزئی مسائل کو بیان کریں گے جو ان سے ہر ایک اصل کے تحت آتے ہیں، یہاں ہم تمام مسائل جزئیہ کا استقصار کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان خاص مسائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن میں ضروریات و حالات زمانہ کے لحاظ سے از سر نو قانون اسلامی کی تدوین و توضیح ضروری ہے

ارتداد احد الزوجین موجودہ زمانہ میں ارتداد کے مسئلہ نے خاص اہمیت اختیار کرلی ہے جہاں تک مرد کے ارتداد کا تعلق ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی لیکن عورت کے ارتداد کے مسئلہ میں پیچیدگی واقع ہوگئی ہے بکثرت عورتیں صرف اس غرض کے لیے مرتد ہوگئی ہیں اور ہو رہی ہیں کہ انہیں ایسے شوہروں سے رستگاری حاصل ہو جو ظالم ہیں یا انہیں ناپسند ہیں۔ اس مسئلہ میں انگریزی عدالتیں اس ظاہر الروایہ پر

عمل کرتی ہیں جو ہدایہ وغیرہ میں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، یعنی اذا ارتد احد الزوجین وقعت الفرقة بغیر طلاق (جب زوجین میں کوئی مرتد ہو جائے تو فرقت بغیر طلاق[ا] واقع ہوتی ہے) لیکن علمار ہند اس قسم کے ارتداد کی روک روکنے کے لیے مشائخ بلخ وسمرقند اور بعض مشائخ بخارا کے فتوے پر عمل کرانا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ارتداد سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے نکاح میں بدستور رہتی ہے۔ اس فتوے کی بنا اس امر پر ہے کہ ایسی عورت چونکہ محض بند نکاح سے رہائی حاصل کرنے کے لیے مرتد بن جاتی ہے، اس لیے اس حیلہ کو روکنے کی یہی صورت ہے کہ نکاح پر اس کے ارتداد کا کوئی اثر تسلیم نہ کیا جائے۔ مگر اس فتوے کو قبول کرنے میں چند مشکلات ہیں جن پر شائد علمار کرام کی نظر ابھی تک نہیں پہنچی:-

اولاً، اسلام اور کفر کے معاملہ میں ملک کا قانون اور اسلامی شریعت دونوں صرف اقرار لسانی کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یہ ثابت کرسکیں کہ ایک عورت دل سے مرتد نہیں ہوی بلکہ صرف اس نیت سے مرتد ہوی ہے کہ اپنے شوہر سے جدا ہو جائے۔

ثانیاً، جو عورت کتابی مذاہب میں سے کسی مذہب میں چلی جائے اس کے حق میں تو بدرجۂ آخر والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتٰب سے فائدہ اٹھا کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے، مگر جو عورت ہندو یا مجوسی ہو جائے یا کسی اور غیر کتابی مذہب میں چلی جائے، اس کو مسلمان مرد کے نکاح میں رکھنا تو قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

ثالثاً۔ جو عورت اسلام کے دائرہ سے نکل کر دوسرے مذہب میں چلی گئی ہے، اس پر اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟ ہم ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہیں۔ اور اس حکومت کی نگاہ میں مسلمان، ہندو، سکھ سب یکساں ہیں۔ ہم اس سے کس طرح یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو جو مثلاً سکھوں یا آریوں کی جماعت میں شامل ہو چکی ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف اسی نکاح پر قائم رہنے کے لیے مجبور

[ا] مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے مسلمان شوہر پر حرام ہو جاتی ہے مگر اس فرقت سے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوسرا نکاح کر سکے۔

کریگی جو اس سے بحالتِ اسلام، اسلامی قانون کے ماتحت کیا گیا تھا؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک ارتداد کے مسئلہ میں مشائخ بلخ وسمرقند کے فتوے سے مسلمان علما کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ درحقیقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عورتیں مرتد کیوں ہوتی ہیں؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے دو چار ہی فی صدی ایسی ہونگی جن کے عقیدہ میں فی الواقع تغیر ہوتا ہے۔ درحقیقت جو چیز ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ظلم وضرر کی بہت سی حالتوں میں رائج الوقت قانون کے تحت عورتوں کے لیے دادرسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ شوہر سخت سے سخت مظالم کرتا ہے، مگر بیوی اس سے خلع حاصل نہیں کر سکتی۔ شوہر ناکارہ ہے، مجنون ہے، خطرناک یا قابلِ نفرت امراض میں یا سخت بیہودہ عادات میں مبتلا ہے، بیوی اس کے نام تک سے نفرت کرتی ہے، باہمی تعلقات منقطع ہیں مگر بندِ نکاح سے آزادی کی کوئی سبیل نہیں۔ شوہر مفقود الخبر ہے، سالہا سال سے اس کا پتہ نہیں، عورت پر زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ مگر اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی قسم کے حالات درحقیقت عورتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے نکل کر کفر کے دامن میں پناہ لیں۔ اس کی روک تھام کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ ادھر ادھر سے فقہی جزئیات نکال کر ان قسمت کی ہاری ہوئی عورتوں کے لیے کفر کے دامن میں بھی کوئی جائے پناہ نہ رہنے دی جائے، اور ان کو ارتداد کے بجائے خودکشی پر مجبور کیا جائے، بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنے قانون پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں اور ان اجتہادی احکام میں ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ترمیم و اصلاح کریں جن کی سختیوں کی وجہ سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اسلام کی آغوش سے نکل کر کفر کی گود میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں تک اللہ اور رسول کے منصوص احکام کا تعلق ہے ان میں قطعاً کوئی ایسی تنگی نہیں جو کسی کے لیے موجب ضیق رہی ہو کجا کہ موجب ارتداد۔ یہ صفت صرف بعض اجتہادی احکام میں پائی جاتی

ہے اور ان احکام کو بعض دوسرے اجتہادی احکام سے بدل کر ارتداد مسلمات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کیا جا سکتا ہے۔

خیار بلوغ | قرآن مجید میں اگرچہ یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ عورت کے نکاح میں اس کے اولیا کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہیے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس قاعدہ کی جو تعبیر فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیار کی رائے کا دخل ہونے کے معنی یہ نہیں کہ عورت اپنی زندگی کے اس اہم معاملہ میں بے اختیار رہے۔ بخلاف اس کے حضور نے ایجاباً عورت کو یہ حق دیا ہے کہ نکاح کے معاملہ میں اس کی رضامندی حاصل کی جائے، چنانچہ ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ابن عباس سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ میرے باپ نے میری مرضی کے خلاف میری شادی کر دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تجھ کو رد و قبول کا اختیار ہے۔ نسائی میں خنسا بنت خدام کی روایت ہے کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کر دیا تھا حضور نے ان کو بھی یہی اختیار دیا۔ دارقطنی میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ ایسے ہی ایک مقدمہ میں حضور نے محض اس بنا پر زوجین میں تفریق کرا دی کہ نکاح لڑکی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے بھتیجے سے اس کا نکاح کر دیا ہے۔ حضور نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کرے چاہے رد کر دے۔ اس پر اس نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ اجزت ما صنع ابی و انما اردت ان اعلم النساء ان لیس الی الآباء من الامر شیٔ"	یا رسول اللہ میرے باپ نے جو کچھ کیا اسے میں نے منظور کر لیا میرا مقصد تو صرف عورتوں کو یہ بتانا تھا کہ ان کے باپ اس معاملہ میں مختار نہیں ہیں۔

مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور موطا میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہے:-

الایم[1] احق بنفسہا من ولیہا والبکر تستأذن فی نفسہا۔ بن بیاہی عورت اپنے ولی سے بڑھ کر اپنے نفس کے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے معاملہ میں اذن لیا جائے۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

لاتنکح الایم حتی تستامر ولا تنکح البکر حتی تستاذن۔ شوہر دیدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لی جائے۔ اور باکرہ کا نکاح نہ کیا جائے جبتک کہ اس کا اذن نہ لیا جائے۔

ولایت اجبار یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اصول شرع میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ نکاح کے لیے عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا باپ یا اور کوئی ولی کر دے تو کیا کسی حال میں اس کا یہ حق کہ اس کے نفس کے معاملہ میں اس کی مرضی کا دخل ہو، ساقط ہو سکتا ہے؟ اس مسئلہ میں ہمارے فقہاء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر نابالغہ کا نکاح اس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو تو لڑکی کو حق ہوگا کہ بالغ ہونے پر اسے چاہے قبول کرے، چاہے رد کر دے لیکن اگر باپ یا دادا نے کیا ہو تو اسے یہ حق نہ ہوگا، الّا یہ کہ باپ یا دادا کا سیئ الاختیار ہونا ثابت ہو جائے، مثلاً وہ فاسق ہو یا بے حیا ہو، یا اپنے معاملات میں سوء تدبیر اور ناعاقبت اندیشی کے لیے مشہور ہو۔

یہ مسئلہ کہ باپ اور دادا کو نابالغہ پر ولایت اجبار حاصل ہے، اور ان کے کیے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیار بلوغ استعمال کرنے کا حق نہیں ہے، قرآن مجید کی کسی آیت، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ محض فقہا کے اس قیاس پر مبنی ہے کہ باپ اور دادا چونکہ لڑکی کے بدخواہ نہیں ہو سکتے

[1] لغت میں ایم ہر اس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر والی نہ ہو، خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ۔

اس لیے لڑکی کے لیے ان کا کیا ہوا نکاح لازم ہونا چاہیے چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ فلا خیار لھما بعد بلوغھما لانھما کاملا الرای وافرا لشفقۃ فیلزم العقد بمباشرتھما کما اذا باشراہ برضھما بعد البلوغ ۔ لیکن یہ محض ایک قیاسی رائے ہے جو خدا و رسول کے احکام کی طرح نہ محکم ہے اور نہ ہوسکتی ہے ۔ نقلاً و عقلاً اس پر متعدد حیثیات سے اعتراض وارد ہوتا ہے ۔

اوّلاً ، حدیث صحیح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی صاحبزادی کا نکاح کمسنی میں عمر بن ابی سلمہ سے کر دیا اور فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد اسے رد یا قبول کرنے کا اختیار رہے اس حدیث سے نابالغہ کے لیے خیار بلوغ مطلقاً ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضور نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ چونکہ لڑکی کا باپ نہیں بلکہ ابن عم ہوں اس لیے میرا کیا ہوا نکاح اس کے لیے لازم نہیں ہے

ثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہو تو باپ یا دادا کے مقابلہ میں اسے اپنی رائے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو لیکن وہی لڑکی اگر نابالغ ہو تو اس کا یہ حق کلیۃً سلب کر لیا جائے ، حالانکہ معاملہ نکاح کے ساتھ عورت کے تعلق کی جس اہمیت کو ملحوظ رکھکر شارع نے اس کو یہ حق دیا ہے وہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے ۔ اگر کسی کے کامل الرائے اور وافر الشفقت ہونے کی بنا پر اس کو ولایت اجبار حاصل ہوسکتی ہے ، تو وہ بلوغ کی حالت میں بھی اسی طرح حاصل ہونی چاہیے جس طرح عدم بلوغ کی حالت میں اسکے لیے ثابت کی جاتی ہے لیکن جب بالغ لڑکی پر کسی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے ، تو نابالغ لڑکی پر کیوں حاصل ہو ؟ ۔

ثالثاً باپ دادا کا وافر الشفقت اور کامل الرائے ہونا کوئی یقینی اور ثابت شدہ امر نہیں ہے ۔ محض کثرت کو دیکھکر ایک قیاس قائم کیا گیا ہے ۔ مگر اس قیاس کے خلاف بھی کثیر واقعات دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جاتے ہیں جن سے وفور شفقت کا ثبوت کم اور کمال رائے کا ثبوت کم تر ملتا ہے ۔

رابعاً ، اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ باپ دادا نیک نیتی کے ساتھ وفور شفقت اور کمال رائے رکھتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکی کا نکاح ایک کم سن لڑکے سے کر دیں اور

لڑکا جوان ہو کر ان کی توقعات کے خلاف نالائق نکلے۔ خصوصاً موجودہ زمانہ میں جبکہ اسلامی تربیت کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے، تعلیم و تربیت کی خرابیوں سے نہایت بری سیرتیں پیدا ہو رہی ہیں اور مسلمانوں کے گردوپیش ایسا خراب ماحول پایا جاتا ہے جس کے بہت بُرے اثرات لڑکوں کے اخلاق و عادات پر مترتب ہو رہے ہیں، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم نہ قرار دیا جائے۔ کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بد اخلاقیوں اور بری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس وقت باپ دادا کی ولایت اجبار خود ان کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔

خامساً، اگر باپ دادا سیئ الاختیار ہوں تو ایک لڑکی کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں خیار بلوغ استعمال کر سکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کو اپنے باپ یا دادا کے خلاف بدنیتی، فسق و فجور، بے حیائی، سوء تدبیر یا حماقت و بلادت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ اور یہ نہ صرف اس کے لیے مشکل ہے، بلکہ سخت معیوب بھی ہے۔

ان وجوہ سے فقہ کے اس جزئیہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اور مصالح کا اقتضاء ہے کہ اس خالص اجتہادی مسئلے میں ترمیم کر کے صغیر و صغیرہ کو ہر حال میں خیار بلوغ دیا جائے۔

خیار بلوغ کی شرائط اس سلسلہ میں فقہاء کا ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ بھی محل نظر ہے۔ باپ دادا کے سوا دوسرے اولیاء کے باب میں فتویٰ یہ ہے کہ اگر انہوں نے صغیرہ باکرہ کا نکاح کر دیا ہو تو وہ خیار بلوغ استعمال کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی بلا تاخیر وہ اپنی نارضامندی کا اظہار کر دے۔ اگر اس نے فوراً اس کا اعلان نہ کیا تو اس کا خیار باطل ہو جائے گا۔ یہ شرط صرف باکرہ کے لیے رکھی گئی ہے۔ ثیبہ اور نابالغ لڑکے کے لیے یہ حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد

جب تک وہ اپنی رضا کی تصریح نہ کریں۔ ان کو خیار فسخ حاصل رہے گا۔

یہ شرط بو حنیفہ نے باکرہ کے لیے رکھی گئی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ خیار فسخ کو بلوغ کے ساتھ مشروط کرنے کی علت اس کے سوا کوئی نہیں کہ سن بلوغ کو پہنچ کر انسان میں برے اور بھلے کی تمیز پیدا ہوتی ہے، اور وہ عقل رسا سے کام لے کر اپنے معاملات میں ذمہ دارانہ فیصلہ کر سکتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی اس کے اندر کوئی بڑا انقلاب رونما ہو اور آناً فاناً وہ ناقص الرائے سے کامل الرائے ہو جائے۔ اور بالفرض اگر ایسا ہوتا بھی ہو تو ثیبہ اور نابالغ لڑکے کا حال باکرہ کے حال سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ پس جب ان دونوں کے خیار بلوغ کو اس وقت تک کے لیے ممتد کیا گیا ہے جب تک کہ وہ قولاً یا فعلاً اپنی رضا کی تصریح نہ کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ باکرہ کو بھی سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے کافی وقت نہ دیا جائے۔ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ بہ نسبت ایک ثیبہ اور ایک نوجوان مرد کے اس کی زیادہ مستحق ہے، کیونکہ وہ غریب تو ان دونوں سے زیادہ ناتجربہ کار ہوتی ہے۔

مہر کے مسئلہ میں یہ امر مسلم ہے کہ اللہ اور رسول کے قانون میں اس کے لیے کوئی آخری حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کے لیے چالیس اوقیہ کی انتہائی حد مقرر کرنی چاہی تھی، مگر ایک عورت نے ان کو ٹوک کر کہا کہ آیت وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْہُ شَیْئًا۔ کی رو سے آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس دلیل کو سن کر حضرت عمر نے فرمایا امرأۃ اصابت ورجل اخطأ۔ پس جہاں تک مہر کی تحدید کا تعلق ہے، قانون میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مہر کی زیادتی میں مبالغہ کرنا اور مرد کی قوت برداشت سے زیادہ مہر باندھنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے

حضور نے فرمایا :-

الزموا النساء الرجال ولا تغالوا فی المھور عورتوں کو مردوں کے پلے باندھنے کی کوشش کرو اور مہروں میں حد سے نہ بڑھو۔

ابو عمرو الاسلمی نے ایک عورت سے دو سو درہم مہر پر نکاح کیا تو آپ نے فرمایا لو کنتم تغرفون الدراھم من اودیتکم ما زادتم (اگر تم کو ندی نالوں میں درہم بہتے ہوئے ملتے تب بھی شاید تم اس سے زیادہ مہر نہ باندھتے)

حضرت انس نے ایک عورت سے چار اوقیہ (۱۶۰ درہم) پر نکاح کیا تو حضور نے فرمایا کانما تنحتون الفضۃ من عرض ھٰذا الجبل۔ (گویا تم اس پہاڑ میں سے چاندی کھود کھود کر نکال رہے ہو)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "عورت کے مہر مقرر کرنے میں حد سے نہ بڑھو۔ اگر یہ دنیا میں کوئی قابل عزت اور آخرت میں تقوی کی بات ہوتی تو تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار کرتے مگر آپ کی ازواج اور صاحبزادیوں میں سے تو کسی کا مہر (۱۲) اوقیہ سے زیادہ نہ تھا۔"

یہ تو محض زیادتی مہر کے متعلق ہے لیکن ہمارے ملک میں جو رواج عام ہو گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں روپیہ کی دستاویزیں مہر مؤجل کے طور پر لکھدی جاتی ہیں۔ مگر نہ اتنی بڑی بڑی رقموں کا ادا کرنا ان کے لکھنے والوں کی قدرت میں ہوتا ہے اور نہ لکھتے وقت وہ اس نیت سے لکھتے ہیں کہ کبھی ان کو مہر ادا کرنا ہے۔ یہ چیز کراہت کی حد سے گذر کر نکاح کے لیے موجب فساد ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمایا ہے کہ۔

من تزوج امرأۃ بصداق ینوی ان لا یؤدیہ فھو زانٍ ومن ادان دینا جس نے ایک مال مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہ کریگا، وہ

تیوی ان لایقضیه فھو سارق۔ دراصل زانی ہے، اور جس نے قرض لیا اور نیت یہ رکھی کہ اس قرض کو ادا کرنا نہیں ہے وہ دراصل چور ہے۔

یہ اس قسم کے مہروں کی باطنی قباحت ہے۔ رہی ظاہری قباحت تو وہ بھی کچھ کم شدید نہیں اس قسم کے مہر باندھنے کا حقیقی مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ شوہر طلاق نہ دے سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافقت ہو جائے اور دونوں مل کر نہ رہ سکیں تو یہی زیادتی مہر عورت کے لیے بلائے جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی نالش کے خوف سے اس کو طلاق نہیں دیتا، اور سالہا سال بلکہ ساری ساری عمر کے لیے غریب عورت معلق پڑی رہتی ہے۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو عام طور پر مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے۔ ان میں سے ایک اہم چیز یہی مہر کی زیادتی ہے۔ اگر اس میں اعتدال برتا جائے تو قریب قریب ۵۰ فی صدی مشکلات رونما ہونے سے پہلے ہی حل ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک اس کی اصلاح کے لیے اصول شرع کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ مہر اگر معجل ہو تو فریقین مختار ہیں کہ بلا کسی حد و انتہا کے جتنا چاہیں مقرر کر لیں لیکن اگر وہ موجل ہو تو لازم قرار دیا جائے کہ اس کی دستاویز باقاعدہ اسٹامپ پر لکھی جائے، اور زر مہر پر پچاس فی صدی قیمت کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا ۵۰ فی صدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویز مہر قابل ادخالِ دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا قانون اگر بنا دیا جائے تو مہر موجل کا یہ سر تا پا عیوب سے بھرا ہوا طریقہ بآسانی مسدود ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنی استطاعت کے مطابق مہر مقرر کریں۔ اور فضولیات میں روپیہ صرف کرنے کے بجائے نقد یا مال و جائداد کی صورت میں نکاح کے وقت ہی مہر ادا کر دیں۔

نفقہ اس باب میں نزاع کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی استطاعت رکھتا ہو مگر نہ دے اور دوسری شکل یہ کہ اس میں استطاعت ہی نہ ہو۔

پہلی صورت میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ قاضی اس کو نفقہ ادا کرنے پر ہر ممکن طریقہ سے مجبور کر سکتا ہے لیکن اگر وہ قاضی کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اس میں اختلاف ہے کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ عورت بطور خود اپنے نفقہ کا انتظام کرے خواہ شوہر کے نام پر قرض لے کر، خواہ محنت مزدوری کر کے، خواہ اپنے کسی عزیز سے مدد لے کر۔ بخلاف اس کے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں قاضی کو بطور خود طلاق واقع کر دینے کا حق ہے۔ بعض علمائے احناف نے مالکیہ کے اس فتوی کو اختیار کرنا پسند کیا ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت خود نفقہ کا انتظام نہ کر سکتی ہو، یا اگر کر سکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہو۔ لیکن یہ شرط کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ قرآن مجید کی رو سے نفقہ عورت کا حق ہے جس کے معاوضہ میں اس پر شوہر کو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص قصداً اس حق کو ادا کرنے سے انکار کر رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو زبردستی اس کے عقد نکاح میں بندھا رہنے پر مجبور کیا جائے۔ جب تک وہ کسی شخص کے نکاح میں ہے اس کی پرورش کا ذمہ دار اس کا شوہر ہے۔ ایسی حالت میں اس کو خود روزی کمانے یا اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے یا ایک ظالم شوہر کے نام سے حصول قرض کی غیر ممکن الحصول کوشش کرنے کی تکلیف میں ڈالنا خلاف عدل معلوم ہوتا ہے۔

دوسری صورت میں پھر حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت کو صبر و احتساب کی تلقین کی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا کہ قرض لے کر یا کسی عزیز سے مدد لے کر گذر کرے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عورت کا نفقہ ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر اس کی پرورش کا بار پڑتا اگر وہ بن بیاہی ہوتی۔ لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکتی ہو اور تفریق کا دعوی کرے تو تفریق کرا دی جائے گی۔ امام مالک کی رائے میں شوہر کو مہینہ دو مہینہ یا کسی مناسب مدت تک مہلت دی جائے گی۔ امام شافعی صرف تین دن کی مہلت

دیتے ہیں، اور امام احمد حنبل کا فتویٰ یہ ہے کہ بلا تاخیر زوجین میں تفریق کرادی جائے۔

اس باب میں نہ صرف قرآن مجید کا وہ قاعدہ جو وبما انفقوا من اموالھم میں بیان کیا گیا ہے۔ ائمہ ثلاثہ کی تائید کرتا ہے، بلکہ احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دارقطنی اور بیہقی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ منقول ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرادی جائے۔ حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ تابعین میں سے سعید بن المسیب کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ اور حضرت عمر ابن عبد العزیز نے بھی تحقیق کے بعد اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔ بخلاف اس کے حنفیہ کا استدلال اس آیت سے ہے کہ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا (۶۵:۱)۔ لیکن اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لیے شرعاً کوئی مقدار معتبر نہیں ہے، بلکہ نفقہ دینے والے کی حیثیت پر انحصار ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو وہاں عورت کو بلا نفقہ گذر کرنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ بلاشبہ یہ عزیمت کا مقام ہے کہ ایک عورت مصیبت اور فاقہ کشی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اسلام ایسی ہی عزیمت کی تعلیم دیتا ہے، اور ایک شریف خاتون کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ لیکن اخلاقی تعلیم اور چیز ہے، اور شرعی حق دوسری چیز۔ نفقہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر وہ برضا و رغبت اس کو چھوڑ دے اور اس کے بغیر ہی شوہر کی رفاقت کرنا پسند کرے تو نہایت قابل تعریف ہے لیکن اگر وہ اس کو نہ چھوڑنا چاہے یا نہ چھوڑ سکے تو قانون اسلامی کے عدل و انصاف میں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ عزیمت کے مقام بلند پر ٹھہرانے کی کوشش کی جائے۔

پس ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں تمام مذاہب میں سے احسن مذہب امام مالک کا ہے جو شوہر کو مناسب مدت تک مہلت دینے کے بعد تفریق کا حکم دیتے ہیں۔

ستم ناروا | آیۂ کریمہ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ ..... فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا۔ (۴ : ۶) کی رو سے شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ بلا کسی جائز سبب کے اپنی بیوی پر کسی قسم کی سختی کرے خواہ وہ آزارِ جسمانی ہو یا آزارِ لسانی۔ اگر وہ ایسا کرے تو عورت کو قانون کی پناہ لینے کا حق ہے اس باب میں کوئی تفصیلی حکم ہم کو نہیں مل سکا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قانون اسلامی کے اصول میں اس کی گنجائش ہے کہ قاضی کو ایسے مظالم سے عورت کی حفاظت، اور ناقابلِ برداشت صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا جاسکتا ہے۔ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقوں میں عورتوں کے ساتھ ناروا برتاؤ کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے، اور شوہریت کے معنی یہ سمجھے جارہے ہیں کہ وہ ظلم وجور کا غیر محدود لائسنس ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ قانون میں اس کے متعلق مناسب احکام کا اضافہ کیا جائے۔

تحکیم | اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو طریق کار اختیار فرمایا ہے۔ وہ ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے کشف الغمہ میں ہے کہ آپ کے پاس ایک مرد اور اس کی بیوی کا مقدمہ آیا۔ آپ نے قرآن مجید کے فرمان فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا کے مطابق حکم دیا کہ دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حکم تجویز کریں پھر دونوں حکموں کو مخاطب کرکے فرمایا "تمہارا کام کیا ہے، جانتے ہو؟ تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کو ملانا مناسب سمجھو تو ملادو، اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کردو" پھر عورت سے دریافت فرمایا، کیا تو ان دونوں پنچوں کے فیصلہ پر راضی ہے۔ اس نے عرض کیا ہاں میں راضی ہوں۔ اس کے بعد مرد سے یہی سوال کیا۔ اس نے کہا اگر وہ ملادیں تو مجھے ان کا فیصلہ قبول ہے اور اگر تفریق کریں تو مجھے قبول نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ لیس ذالک لک، لست بہارح حتی ترضی بمثل ما رضیت بہٖ تجھے اس کا حق نہیں تو یہاں سے نہیں جاسکتا جب تک کہ اسی طرح تو بھی اپنی رضامندی کا اقرار نہ کرے جس طرح اس عورت نے کیا ہے"۔

میاں بیوی کے ایسے خانگی جھگڑوں میں جن کا تعلق بڑے اور اہم قانونی مسائل سے نہ ہوا

تحکیم کے اس طریقے کو اختیار کرنا انسب ہے، اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق قانون میں چند ایسی دفعات کا اضافہ کیا جائے، جن میں تحکیم کے طریقہ، اور حکمین کے اختیارات اور ان کے متفقہ فیصلہ کے طریق نفاذ، اور اختلاف رائے کی صورت میں عدالت کے طریق کار کی صراحت کر دی جائے۔ (باقی)

مرآۃ المثنوی

مرتبہ

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولنا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں۔ جن کی مدد سے آپ حسب نشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسی سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے

کاغذ کتابت طباعت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت ؁ سکہ انگریزی ؏ سکۂ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے۔